ماہنامہ

اِنذار

مدیر

ابو یحییٰ

اپریل 2018

"دنیا جب تک آپ کے گھر میں ہے
یہ آپ کی غلام رہے گی
دنیا جب آپ کے دل میں آجائے گی
یہ آپ کی آقا بن جائے گی"

www.inzaar.org

ماہنامہ
اِنذار
اپریل 2018ء رجب/شعبان1439ھ
جلد 6 شمارہ 4

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ،
سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

لیموں کا سبق

میرے گھر میں لیموں کا ایک درخت لگا ہے۔ الحمدللہ اس میں بڑی تعداد میں لیموں اگتے ہیں۔ مگر یہ لیموں توڑنے کے لیے ان انتہائی باریک اور نوکدار کانٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو لیموں سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں اس درخت پر لگے ہوئے ہیں۔ لیموں توڑتے ہوئے باہر نکلے یہ کانٹے مجھے زخمی کرتے ہیں یا کپڑوں میں الجھ جاتے ہیں۔ اس دفعہ لیموں توڑتے ہوئے میں نے اپنے ساتھ اپنے بچے کو بھی شریک کرلیا۔ جو پہلا سبق اسے میں نے سکھایا وہ یہ تھا کہ ہمیں اگر لیموں توڑنے ہیں تو کانٹے کی شکایت نہیں کرنی چاہیے بلکہ ان کو نظر انداز کر کے اپنا کام کرنا چاہیے۔

خدا کی دنیا کا یہ اصول ہے کہ یہاں آپ کے مطلوبہ پھل کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ ان کی شکایت کرنا بے فائدہ عمل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو نظر انداز کر کے اپنا کام کیا جائے۔ اس دنیا میں اچھے لوگوں کے ساتھ برے، اعلیٰ کے ساتھ پست، نیک کے ساتھ بدلوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ خدا کی دنیا میں جینے کا طریقہ یہی ہے کہ بدوں کی برائی پر صبر کیا جائے۔ تب ہی ہم نیکوں کی اچھائی کو پا سکتے ہیں۔

لیموں کا دوسرا سبق اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ زندگی اگر آپ کو ایک لیموں دے تو آپ اس میں چینی ملا کر اس کا شربت بنا لیجیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لیموں کا یہ شربت بہت مزیدار ہوتا ہے۔ لیکن یہ شربت اسی کو ملتا ہے جو اپنے پاس سے مٹھاس ملا کر لیموں کی کھٹاس کو شربت میں بدل دے۔ جو شخص اپنے پاس سے مٹھاس نہیں دے سکتا اس کو یہ شربت نہیں مل سکتا۔

زندگی میں بارہا ہمیں ''میٹھے'' کے بجائے ''کھٹے'' لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہمارے اندر اگر مٹھاس ہے تو یہ لوگ ہمارے لیے ''شربت'' بن سکتے ہیں۔ لیکن اس ''مٹھاس'' کے لیے صبر چاہیے۔ جو شخص یہ صبر کر لیتا ہے اس کی زندگی ہر ذائقے سے بھر جاتی ہے۔

ان الحکم الا للہ

”ان الحکم الا للہ“ کا جملہ قرآن مجید میں تین مقامات یعنی سورہ انعام آیت 57، سورہ یوسف آیت 40 اور آیت 67 میں آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمام اختیار اللہ ہی کا ہے۔ اس حقیقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے۔ مگر اس کا دوسرا تقاضا وہ ہے جو سورہ یوسف آیت 67 میں یہ جملہ کہتے ہوئے حضرت یعقوب نے فرمایا تھا کہ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

جس طرح یہ بات ایک مسلمہ ہے کہ تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں انتہائی کریم، رحیم اور مہربان ہستی ہیں۔ ان کے ہر فیصلے میں خیر اور بھلائی ہوتی ہے۔ مگر اسباب کی دنیا میں بعض اوقات ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان یہ سوال کرتا ہے کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا یا ایسے کیوں ہونے دیا۔

مگر یعقوب علیہ السلام نے بڑی خوبصورتی سے اس حقیقت کی طرف رہنمائی کی ہے کہ انسان کو ہر حال میں اللہ پر توکل اور بھروسے سے کام لینا چاہیے۔ اسے بدترین حالات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بظاہر کوئی مشکل آجائے، بظاہر کوئی مسئلہ پیدا ہوجائے، بظاہر کوئی اسباب کی دنیا لٹ جائے؛ مگر انسان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا معاملہ اس کے رب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ رب ہر حال میں بندے کی مدد کو آئے گا۔ وہ اپنے پکارنے والوں کو مایوس نہیں کرتا۔

یہ وہ توکل ہے جو ایمان کی روح ہے۔ یہ نہ ہو تو ایمان ایک کھوکھلی شے کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جس شخص میں توکل والا یہ ایمان پیدا ہوجائے تو وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ کبھی بے عمل نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی مسرت اور دل اطمینان سے بھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اپنے ایسے بندوں کی مشکلات دور کر کے ان کی مدد کرتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کو عزت دیتے ہیں۔

پیغمبرانہ بصیرت

مسلمانوں میں نومولود کی پیدائش پر بچے کا عقیقہ کرنے کا رواج پایا جاتا ہے۔عام طور پر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔تاہم بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے امام یعنی امام اعظم امام ابوحنیفہ عقیقہ کو کوئی مشروع چیز نہیں سمجھتے۔اس کا سبب یہ ہے کہ عقیقے کے حوالے سے کتب احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان ملتا ہے کہ انالا احب العقوق یعنی میں عقیقہ کو پسند نہیں کرتا۔ایک دوسری روایت میں یہ بات ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عقیقہ پسند نہیں،(النسائی،رقم 4223) ظاہر ہے کہ اگر حضور علیہ السلام کا یہ تبصرہ کسی عمل کے متعلق موجود ہے تو پھر اس پر سنت ہونے کا حکم لگانا ممکن نہیں رہتا۔

تاہم جمہور علماء کی رائے اس کے برعکس ہے۔وہ اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں اور اس کی وجہ روایات میں یہ بات بیان ہونا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسوں اور نواسیوں کا عقیقہ کیا۔چنانچہ بیان ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت حسن اور حضرت حسین کی پیدائش پر ایک ایک یا بعض روایات کے مطابق دو دو مینڈھے یا دنبے قربان کیے۔

علم کی دنیا میں اس حوالے سے بہت بحث ہے کہ کس طرف کا نقطہ نظر درست ہے اور کس کے پاس زیادہ محکم دلائل ہیں۔ جو لوگ علمی ذوق رکھتے ہیں وہ فقہ کی کتابوں میں یہ بحث دیکھ سکتے ہیں۔ہم اس علمی بحث کے اندر پیغمبرانہ بصیرت کا ایک روشن نمونہ دیکھتے ہیں اور وہی اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقیقے کا رواج زمانہ جاہلیت سے چلا آرہا تھا۔عقیقہ ان پیدائشی بالوں کو کہتے ہیں جو بچہ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے۔نیز اس جانور کو بھی کہتے ہیں جو اس موقع پر قربانی کیا جاتا ہے۔عربوں کا دستور تھا کہ بچے کے لیے جانور ذبح کرتے تو اس کے خون سے

بچے کے سر کو رنگ دیتے تھے۔ محسوس یہ ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیقے کے اسی پہلو پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ ذوق پر خون ملنے کا یہ عمل گراں گزرا ہوگا اور امکان ہے کہ آپ نے اسی پر تبصرہ کیا ہوگا۔ تاہم چونکہ قربانی اپنی ذات میں شروع ہی سے ایک اہم عبادت رہی ہے اور اولاد کا ہونا شکر گزاری کا ایک موقع ہوتا ہے، اس لیے آپ نے لوگوں کو اس کی اجازت یہ کہہ کر دے دی کہ اس موقع پر جو چاہے وہ قربانی کرلے (مسند احمد، رقم 11/65)۔ پھر خود بھی آپ نے اپنے نواسوں کی پیدائش پر قربانی کی، ان کے بال کٹوائے لیکن بچے کے سر پر خون ملنے سے احتراز کیا۔

اس واقعے سے جو سبق سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی معاشرے میں بری رسم چل رہی ہو تو لٹھ لے کر اس کے پیچھے نہیں پڑ جانا چاہیے۔ بلکہ جو اس میں خامیاں اور برائیاں ہیں ان کو دور کر کے ان میں جو خیر ہے اس کو سند جواز دے دینا چاہیے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رسوم و رواج کسی معاشرے میں صدیوں میں جا کر قائم ہوتے ہیں۔ ان کو ختم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ خاص کر ایک مصلح کی اصل توجہ چند بنیادی باتوں کی طرف ہوتی ہے۔ وہ اگر ہر معاملے میں معاشرے سے ٹکرانے لگے گا تو لوگ اس کی بنیادی اور اصل باتوں کو بھی اہمیت دینا چھوڑ دیں گے۔ اس لیے جو چیز عام پھیلی ہوئی ہو، اس میں اگر کوئی خرابی ہے تو اس کو دور کر دینا اور اس پر ناپسندیدگی کا اظہار ہی کافی ہے۔

لیکن اس میں اگر کوئی خیر ہے جیسے کہ عقیقے میں جانور ذبح کرنا اصلاً قربانی کی عظیم عبادت کا تسلسل ہے تو اس خیر کو باقی رکھنا ایک فطری طریقہ ہے۔ اس حکیمانہ طریقے کی بنا پر دین کا اصل پیغام بھی زندہ رہتا ہے اور مصلح کو غیر ضروری طور پر اپنے معاشرے سے ٹکرانا بھی نہیں پڑتا۔

سری دیوی کے سوالات

بھارتی اداکارہ سری دیوی کی اچانک موت پوری دنیا میں ان کے مداحوں کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اداکاری کے پیشے میں جسمانی فٹنس ایک بنیادی تقاضا ہوتا ہے۔ چنانچہ اداکار تا عمر اپنی صحت کا بے حد خیال رکھتے اور عام طور پر لمبی عمر پاتے ہیں۔ایسے میں چون برس کی عمر گویا کہ اس پیشے میں کم سنی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس عمر میں مرجانا ایک المیے سے کم نہیں۔مگر سری دیوی کا ایک المیہ اور ہے جس پر بات ہونی چاہیے۔

سری دیوی کا اصل المیہ یہ ہے کہ بظاہر وہ تیاری کے بغیر اپنے مالک کے حضور پہنچی ہیں۔امتحان کی جس مدت کے لیے انھیں تخلیق کیا گیا تھا وہ ختم ہوچکی ہے۔جو غیر معمولی حسن، مواقع ، کامیابی، دولت اور شہرت انھیں دی گئی تھی، وہ واپس لے لی گئی ہے۔اب صرف احتساب بچا ہے۔اب صرف سزا و جزا بچی ہے۔ مالک کائنات جو ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے باخبر ہے، ان سے ایک ایک لمحے اور ایک ایک نعمت کا حساب لے گا۔ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۔

ہم بصیرت سے عاری جس دور میں زندہ ہیں، وہاں بعض نادانوں کا خیال ہے کہ ہمارے جیسے پیدائشی مسلمان موت کے ساتھ ہی فردوس میں بھیجے جائیں گے اور سری دیوی جیسے پیدائشی ہندو مرتے ہی جہنم رسید کردیے جائیں گے۔ چلیے یہ مقدمہ مان لیتے ہیں۔اس لیے کہ اس سے دل بہت خوش ہوتا ہے، مگر ضمیر کہتا ہے کہ خود کو سری دیوی کی جگہ رکھ کر ایک دفعہ ضرور سوچنا چاہیے۔

خود کو جب سری دیوی کی جگہ رکھا جائے تو خیال آتا ہے کہ وہ جب خدا کے سامنے کھڑی ہوگی اور خدا کی عظمت کو دیکھے گی تو اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ایک ہی سوال ہوگا۔ میں تو ہندوؤں میں پیدا ہوئی تھی، یہ جو میرے اردگرد کروڑوں مسلمان بستے تھے، انھوں نے مجھے خدائے رحمٰن اور اس کی ابدی فردوس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟

ان حاملین قرآن کے لیے خدا کی جنت وجہنم اور خدا کی ہستی سب سے بڑا مسئلہ کیوں نہیں بنی؟ انھوں نے دنیا کو خدا کے اس عظیم منصوبے اور آخرت کی اس ابدی دنیا کے بارے میں کیوں نہیں بتایا جس کے لیے عارضی دنیا بنائی گئی تھی۔

میں دنیا کی زندگی کو نرکھ اور سورگ سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگتی رہی۔ مسلمان بھی دنیا کو جنت اور جہنم سمجھ کر اس کے عیش وغم کے لیے دوڑتے رہے۔ دولت، شہرت، مال، جمال، عورت، لذت، کیریئر اور دنیوی مفادات میری قوم میں بھی کامیابی کا اصل معیار تھے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی کسی شخص کی کامیابی اور خوش نصیبی کو جانچنے کے یہی معیارات تھے۔ کرپشن، بددیانتی، دنیا پرستی میرے دیش میں بھی عام چلن تھا۔ مسلمانوں کے دیش کا حال بھی یہی تھا۔ میری قوم بھی ذات پات کی اسیر تھی۔ مسلمان بھی برادریوں اور قومیتوں کی تفریق میں بٹے ہوئے تھے۔

میں بتوں کو اپنے سامنے بٹھا کر پوجتی رہی۔ یہ بھی مقدس شخصیات کو قبر میں لٹا کر پوجتے رہے۔ میں اپنے پیدائشی تعصب سے اوپر اٹھ کر حق کو تلاش نہیں کرسکی۔ مسلمان بھی اپنے تعصّبات اور فرقوں سے اوپر اٹھ کر تلاش حق کو اپنا مسئلہ نہیں بنا سکے۔ میرے مذہبی رہنماؤں کے لیے ہندوتوا یعنی ہندو قوم کا عروج کرنے کا اصل کام تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں نے بھی ان کی قوم کے سامنے یہی مقصد رکھا۔ غلبہ واقتدار کی بات کرنے والوں کو میری قوم میں بھی زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ مسلمانوں میں بھی بڑے لیڈر وہی تھے جو غلبہ اور اقتدار کی بات کرتے تھے۔ میری قوم میں بھی ان گنت مذہبی گروہ تھے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی درجنوں فرقے موجود تھے۔

عالم کا پروردگار جب سری دیوی کا احتساب شروع کرے گا تو اپنا فیصلہ سنائے جانے سے قبل وہ مسلمانوں کے بارے میں یہ سارے سوالات کرنے کی اجازت ضرور طلب کرے گی۔ امید ہے کہ اسے یہ سوالات کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔

عاصمہ جہانگیر

گیارہ فروری 2018 بروز اتوار معروف قانون داں عاصمہ جہانگیر کا انتقال ہوگیا۔ میں نے یہ خبر اسلام آباد کلب میں سنی جہاں میں آخرت کی زندگی پر ایک لیکچر دے رہا تھا۔ اس لیکچر کا آغاز اس بات سے ہوا تھا کہ موت آخرت کی ابدی زندگی کا دروازہ ہے اور قرآن مجید آخرت کے حوالے سے اہم ترین چیز یہ بیان کرتا ہے کہ کل نفس ذائقة الموت یعنی ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

عاصمہ جہانگیر کے انتقال کے بعد اگلے کئی دنوں ان کی شخصیت، عاقبت اور جنازہ جن جن پہلوؤں سے میڈیا اور خاص کر سوشل میڈیا پر زیر بحث آتے رہے، اس کے بعد مجھے ایک ہی احساس ہوا۔ ہم لوگ موت، آخرت اور خدا جیسے اہم ترین حقائق کو بھول کر جیتے ہیں۔ ہم لوگ بھول چکے ہیں کہ موت دوسروں ہی کو نہیں ہمیں بھی آنی ہے۔ ہم بھول چکے ہیں کہ موت کے ساتھ ہی ہمارا احتساب اس طرح شروع ہوجائے گا کہ ہمیں اپنے ایک ایک لفظ کا حساب دینا ہوگا۔ ہم بھول چکے ہیں کہ ہمارے دین میں الزام و بہتان ہی نہیں، سنی سنائی بات بلا تصدیق آگے پھیلانا بھی ایک گناہ ہے۔

ہم بھول چکے ہیں کہ ہمارے دین میں جان اور مال کی طرح لوگوں کی عزت کو پامال کرنا بھی ایک جرم ہے۔ ہم بھول چکے ہیں کہ دعوتی سوچ اور اخلاقی رویہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔ ہم بھول چکے ہیں کہ ہمارے نبی نے اپنے بدترین دشمنوں کو اپنے حسن خلق سے دوست بنالیا تھا۔ ہم بھول چکے ہیں کہ کسی کی موت پر اس کا احتساب کرنا ایمان نہیں بلکہ اپنی موت کو یاد کر کے اپنا احتساب کرنا اصل ایمان ہے۔

عاصمہ جہانگیر کا فیصلہ ان کا رب ہی کرے گا۔ مگر لگتا ہے کہ عالم کے پروردگار نے جاتے جاتے ان سے ایک خدمت ضرور لی ہے۔ وہ یہ کہ ان کی موت سے ہمارے اخلاقی ننگے پن کو بالکل کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔

عاصمہ جہانگیر کا احتساب

کسی فرد کی عاقبت کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کی وہ حد ہے جس میں خود داخل ہونا انتہائی نادانی کی بات ہے۔ اس حوالے سے زیادہ سے زیادہ کسی کے حق میں اس کے ایمان و عمل کی بنیاد پر حسن ظن کا اظہار تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کسی کے بارے میں کوئی منفی فیصلہ سنانا خود اپنی آخرت کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس میں بس انھی لوگوں کا استثنا ہے جن کا فیصلہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ سنا چکے ہیں۔ قرآن کے بعد اب وہ روزِ قیامت ہی لوگوں کا فیصلہ سنائیں گے۔

تاہم قرآن مجید کی بنیاد پر ہم یہ بات جانتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کا احتساب کن بنیادوں پر ہوگا۔ ان بنیادوں میں سے پہلی اور سب سے اہم ایمان ہے۔ قرآن مجید اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ایمان مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کا نام نہیں۔ یہ حق اور سچائی کے اعتراف کا نام ہے۔ یہ کام مشرکوں کے گھروں میں پیدا ہونے والی شخصیات کر لیں تو صحابہ کرام کہلانے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ نہ کریں تو پیغمبروں کی اولاد بنی اسرائیل بھی کفر کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

آج کے دور میں مرنے والا ایک مسلمان چاہے کوئی ''عاصمہ جہانگیر'' ہو یا کوئی عالم دین، ہر کسی سے پہلا سوال ایک ہی ہوگا۔ جب حق اور سچائی تمھارے پاس آئی تو تمھارا ردعمل کیا تھا؟ کیا تم اپنے تعصب سے چمٹے رہے یا اس کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے؟ جو نظریات، خیالات، افکار ایک دفعہ قائم کر لیے، ان کی محبت میں گرفتار رہے یا حق پرستی کو شعار بنایا؟ اپنے خاص نقطہ نظر یا فرقے کے اسیر رہے یا آگے بڑھ کر سچ کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟

حقیقت یہ ہے کہ اپنے گروہ، اپنے نقطہ نظر اور فرقے کو آخری حق سمجھنے والے آج کے مسلمان اگر یہ بات جان لیں کہ اس پہلے سوال ہی میں وہ خدا کے ہاں پکڑے جائیں گے تو وہ عاصمہ جہانگیر کو بھول کر اپنی فکر میں لگ جائیں گے۔

داعی اور قاضی

عالم اسلام کے معروف عالم شیخ محمد غزالی کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ان سے کسی نوجوان نے پوچھا کہ نماز ترک کردینے والے کا کیا حکم ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کا حکم یہ ہے کہ اسے اپنے ساتھ مسجد لے جاؤ۔ یہ نوجوان شیخ سے توقع کر رہا تھا کہ وہ تارک صلوٰۃ کے بارے میں کفر کا فتویٰ دیں گے، مگر انھوں نے اس کو اپنے جواب سے یہ بات سمجھائی کہ لوگوں کا فیصلہ کرنے والے قاضی کے بجائے انھیں بھلائی کی طرف بلانے والے داعی بنو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دین ایک دعوت ہے جو لوگوں کو دی جانی ہے۔ یہ ایک امانت ہے جو ہمیں لوگوں تک پہنچانی ہے۔ ایک داعی مَا أَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا) کی نفسیات میں جیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قرآن کی تعلیم عَلَیْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ (تمھارے ذمے پہنچانا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے) کی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ کسی فرد کا آخری انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ وہ لوگوں کی آخرت کے فیصلے کرنے اور ان پر فتویٰ دینے کے بجائے ان تک صحیح بات پہنچانے اور انھیں دعوت دینے میں مصروف رہتا ہے۔

مگر بدقسمتی سے اس کے عین برعکس ہمارا مذہبی طبقہ ایک مختلف نفسیات میں کھڑا ہے۔ ہم لوگ کسی نہ کسی فرقے یا گروہ ہی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہماری فکری اٹھان ہی یہ ہوتی ہے کہ ہم فرقہ ناجیہ ہیں اور باقی سب جہنمی۔ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل ہیں۔ جو ہم نے سمجھ لیا وہ سچ ہے اور باقی سب گمراہی ہے۔

اس فکر کے ساتھ لوگوں میں کبھی یہ دردمندی اور ذمہ داری پیدا نہیں ہوسکتی کہ انھوں نے خدا کے بندوں کو خدا کی جنت کی طرف بلانا ہے۔ اسلام کے حوالے سے لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنی

ہیں۔اس نفسیات کا انسان داعی نہیں رہتا وہ قاضی بن جاتا ہے۔وہ لوگوں کے کفر اور ان کی جہنم کے فیصلے سناتا ہے۔وہ یہ بھول جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل اور عبداللہ بن ابی جیسے لوگوں کی موت کے بعد بھی انھیں برا بھلا کہنے سے منع کیا تاکہ ان کے گھر والوں کی دل آزاری نہ ہو۔حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے کفر ونفاق اور جہنم کا فیصلہ اللہ تعالیٰ خود سنا چکے ہیں۔

ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے کفر اور ان کی جہنم کے فیصلے سنا کر اسلام کی خدمت کررہے ہیں۔حالانکہ ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ صرف اور صرف خدا کا حق ہے کہ وہ کسی فرد کی آخرت کا فیصلہ کردے۔ہم نہ کسی فرد کی جنت کا فیصلہ سنا سکتے ہیں نہ اس کے جہنمی ہونے کا اعلان کرسکتے ہیں۔ ہمارا منفی پہلو سے کوئی کام ہوسکتا ہے تو وہ یہ کہ کسی کا نام لیے بغیر ایک غلط رویے کی غلطی دلائل اور شائستگی کے ساتھ واضح کردیں۔

لیکن اس سے کہیں بڑھ کر کوئی کرنے کا کام ہے تو وہ یہ کہ اسلام کی دعوت درست طریقے سے پیش کی جائے۔لوگوں کے سوالات کے جواب دیے جائیں۔جو لوگ اسلام کے مخالف ہیں ان کو برا بھلا کہنے کے بجائے ان کا اصل اعتراض سمجھنے کی کوشش کریں اور مدلل طریقے سے اس کا جواب دیں۔اگر کسی معاملے میں واضح ہوجائے کہ غلطی ہمارے ہی فہم دین میں ہے تو اپنے تعصب کا اسیر ہونے کے بجائے غلطی کو تسلیم کریں اور اس صاحب علم کی رائے کو سنیں جس کی بات قرآن وسنت سے زیادہ قریب ہے۔

دورِ جدید میں یہی وہ ناصحانہ مزاج ہے جس کی مذہب سے وابستہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔یہ مزاج جس روز مسلمانوں میں پیدا ہوگیا، پوری دنیا میں اسلام پھیل جائے گا کیونکہ آج کا انسان ہمیشہ سے بڑھ کر سچائی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔

ابو یحییٰ

تربیت اور قانون

ہماری قوم کے مسائل کا سبب کیا ہے اور کس طرح ہم ختم نہ ہونے والے زوال اور انتشار سے نکل کر بام عروج پر چڑھنا شروع کریں گے، یہ میرے لیے ہمیشہ سے ایک دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ دردِ دل کے علاوہ اس کا ایک سبب تاریخ سے دلچسپی بھی ہے۔ میں نے اس موضوع پر تاریخی نوعیت کی ایک کتاب ''عروج وزوال کا قانون اور پاکستان'' کے نام سے لکھی بھی ہے۔ گرچہ اب میں اس طرح کے موضوعات پر عموماً نہیں لکھتا مگر عملاً جو کام کر رہا ہوں وہ اس حوالے سے میرے نتائج فکر ہی کی پیداوار ہے۔ ان نتائج فکر میں سے ایک اہم پر میں آج تفصیل کے ساتھ بات کرنا چاہوں گا۔

تربیت کے بجائے قانون پر زور

میرے نزدیک ہمارے قومی مسائل کی ایک اہم وجہ ہماری یہ سوچ ہے کہ ہم ہر مسئلے کا حل قانون میں تلاش کرتے ہیں اور تربیت کو کوئی کام نہیں سمجھتے۔ اس بات کو چند مثالوں سے قارئین سمجھ سکتے ہیں۔

ایک مثال ہمارا ملکی قانون ہے۔ ہمارا سب سے بنیادی قانون ہمارا قومی دستور ہے۔ ہمارا دستور انسانی تاریخ کا پہلا دستور نہیں۔ خود پاکستان کا یہ تیسرا دستور ہے۔ اس پہلو سے دستور بنانے والوں کے سامنے بہت سے نظائر موجود تھے۔ اسی طرح دستور بنانے والے لوگ بہت منجھے ہوئے سیاستدان اور بہت ماہر قانون دان تھے۔ انھوں نے اپنی طرف سے کسی پہلو میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس آئین میں تبدیلی وترمیم کا راستہ بھی کھلا ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود حیرت

انگیز طور پر ہماری پوری سیاسی تاریخ اداروں کے ٹکراؤ کی ایک داستانِ مسلسل ہے۔ کبھی وفاق اور صوبوں میں جھگڑا رہا۔ کبھی چھوٹے اور بڑے صوبوں میں تصادم رہا۔ کبھی اپوزیشن حکومت کے خلاف تحریکیں چلاتی اور دھرنا دیتی رہی ہے۔ کبھی فوج مارشل لا لگاتی رہی ہے۔ کبھی صدر اور وزیر اعظم کا ٹکراؤ ہوا اور وزیر اعظم برطرف ہوئے۔ کبھی چیف جسٹس اور وزیر اعظم کے ٹکراؤ میں چیف جسٹس فارغ ہوئے۔ کبھی صدر کی چھٹی ہوئی اور کبھی آرمی چیف برطرف ہوئے۔ کبھی فوج اور پارلیمنٹ میں کشمکش رہی۔ کبھی تین بڑوں یعنی وزیر اعظم، چیف جسٹس اور آرمی چیف میں کشمکش ہوتی رہی۔ کبھی عدلیہ اور پارلیمنٹ کا ٹکراؤ ہوا۔

یہ سب کچھ ہوا اور اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ ہمارا آئین مکمل وضاحت کے ساتھ ہر ادارے اور ہر عہدے کی حدود، ذمہ داریوں اور دائرہ کار کا تعین کر دیتا ہے۔ مگر اصل مسئلہ آئین یا قانون کا نہیں، بلکہ انسانوں کا ہے جو اپنی حدود میں رہنا نہیں جانتے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم انسان سازی کے بجائے قانون سازی کو مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔

ایک دوسری مثال لیجیے۔ پاکستان بنا تو ہماری مذہبی جماعتوں نے ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کی جدوجہد شروع کر دی۔ کئی عشروں کی جدوجہد کے بعد جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں علماء کی منشاء کے مطابق آئینی اور قانونی تبدیلیاں بڑی حد تک آ گئیں۔ پاکستان کے اسلامی نام سے لے کر خدا کی حاکمیت اعلیٰ تک، قرار داد مقاصد سے لے کر حدود آرڈیننس تک، زکوٰۃ کی کٹوتی سے لے کر نظام صلوٰۃ تک، مقدس شخصیات کی توہین کی سزا کے قانون سے لے کر صدر و وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی پابندی تک، قانونی اور آئینی اقدامات کی ایک فہرست ہے جو بیان کی جا سکتی ہے۔

مگر سماج پر اس کے کیا اثرات پڑے، معاشرے میں خیر و فلاح کتنی عام ہوئی، اسلام کا کتنا

مثبت تعارف دنیا تک پہنچا، عام آدمی کی زندگی کتنی بہتر ہوئی، معاشرے سے جرائم اور بدی کتنی ختم ہوئی؛ ان سب سوالات کے جواب لوگ جانتے ہیں۔

ایک تیسری مثال ہمارے عمومی قانون کی ہے۔ پاکستان بے گنتی قوانین اور ضابطوں کی کیسی آماجگاہ ہے، اس حقیقت کو ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے اس ملک میں کاروبار یا فلاحی خدمت کے لیے کوئی ادارہ بنانے کی کوشش کی ہو۔ چلیے یہ تجربہ کسی کو نہ ہوا ہو تو سرکاری دفاتر اور اداروں سے تو ہر شخص کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ہر معاملے میں آپ کو ضابطوں، قاعدوں اور قوانین سے سابقہ پیش آئے گا۔ بعض اوقات تو ایسے ایسے عجیب ضابطے سامنے آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ کوئی معقول آدمی یہ ضابطہ کیسے بنا سکتا ہے۔

مگر ان سب ضابطوں اور قاعدوں کے باوجود وہ سارے مسائل باقی رہتے ہیں جن سے بچنے کے لیے یہ ضابطے قاعدے بنائے گئے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر برس لاکھوں چھوٹے بڑے ٹریفک حادثات ہوتے ہیں جن میں بے گنتی لوگ ہلاک اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ اب آپ ٹریفک کی کوئی کتاب کھولیے اور دیکھیے کہ ہمارے ملک میں ٹریفک کے کیا کیا قوانین موجود ہیں۔ اسی طرح گاڑیوں کی فٹنس کی شرائط اور معیارات نکال کر دیکھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قانون میں کسی قسم کا سقم نہیں ہے اور ان گنت ضابطے یہاں موجود ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ گاڑیاں چلانے والے ہر قانون کو بالائے طاق رکھ کر گاڑیاں چلاتے ہیں۔ اسی طرح قانون پر عملدرآمد کروانے والی ٹریفک پولیس کی رگ و پے میں کرپشن سرائیت کی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی قانون اس طرح کے مسائل کو حل نہیں کر سکتا۔

قانون سازی اور انسان سازی

اس صورتحال کا بنیادی سبب ہمارے ہاں اس شعور کا فقدان ہے کہ سماج میں بہتری قوانین

سے نہیں انسانوں کی تربیت سے ہوتی ہے۔ کسی ملک میں تربیت کے ادارے لوگوں میں اخلاق اور اقدار کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ ان کو یہ سکھاتے ہیں کہ ہر قدم پر عدل و انصاف کا خیال رکھنا چاہیے اور ظلم و زیادتی سے بچنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ریاست ایک نظم قائم کرنے کے لیے کچھ قوانین بناتی ہے۔ خیال رہے کہ ''کچھ'' قوانین بناتی ہے، ہماری طرح قوانین کی بھرمار کر کے عام لوگوں کی زندگی اجیرن نہیں کرتی۔ ہر سماج میں چونکہ کچھ نہ کچھ لوگ تربیت کے باوجود قانون کی خلاف ورزی کا مزاج رکھتے ہیں، اس لیے ان سے نمٹنے کے لیے مزید کچھ قوانین بنائے جاتے ہیں۔ تربیت کے ادارے اخلاق و اقدار کی تعلیم کے ساتھ قانون کی پابندی کا شعور بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بیشتر لوگ ساری زندگی قانون کی پکڑ کے خوف کے بغیر بھی قانون کی پاسداری کرتے ہیں۔ چند لوگ جو خلاف ورزی کرتے ہیں، ان سے نمٹنے کے لیے قانون کی طاقت بہر حال موجود رہتی ہے۔

مگر ہمارے ہاں یہ المیہ ہوا ہے کہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ قانون بنانا سماج سے برائی اور خرابی کا خاتمہ کرنے کا راستہ ہے۔ یہ حقیقت نہیں سمجھی گئی کہ اصل مقصد قانون سازی نہیں انسان سازی ہے۔ یہ چیز صرف اور صرف تربیت سے پیدا ہوتی ہے۔

تربیت کے بغیر قانون سازی کئی وجوہات سے غیر موثر ہو جاتی ہے۔ قانون انسان بناتے ہیں۔ اگر وہ بگڑے ہوئے ہیں تو ہمیشہ ایسا قانون بنائیں گے کہ ان کے اپنے مفادات کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ قانون ساز افراد کو رشوت دے کر اپنے حق میں قانون سازی کرائی جائے۔ اسی طرح قانون پر انسان ہی عمل کرتے ہیں اور انسان ہی عمل درآمد کرواتے ہیں۔ اب اگر انسان ہی غیر تربیت یافتہ ہیں، ان کا اخلاقی شعور پوری طرح بیدار نہیں، ان میں قانون کی پاسداری کی قدر کو پیدا نہیں کیا گیا تو ایسے لوگ مفاد، خواہش یا محض عادت کی وجہ سے

قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے۔

فکری قیادت اور تربیت کے اداروں کی تباہی

تربیت کے بجائے قانون پر زور کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو تربیت کا شعور پیدا کرنا دراصل فکری قیادت کا کام ہے۔ مگر بدقسمتی سے آزادی کے بعد جو لوگ فکری قیادت کے مقام پر فائز تھے، وہ تربیت کا کام چھوڑ کر سیاست میں اتر گئے۔ سیاست کے ظاہر ہے کہ اپنے اصول ہوتے ہیں جس کا، کم از کم ہمارے ہاں، اقدار اور تربیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب فکری قیادت نے اپنی جگہ چھوڑ دی جس کا کام ہی تربیت کرنا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تربیت کے تمام ادارے رفتہ رفتہ اپنے کام چھوڑتے چلے گئے۔ ماں کی گود سے لے کر خاندان کے بزرگوں تک، اسکول کے اساتذہ سے لے کر ائمہ مساجد تک، اہل دانش سے لے کر اہل مذہب تک لوگوں کی تربیت، اخلاق کی ترویج، اقدار کا فروغ کسی کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس کے بعد جیسی قوم بن سکتی تھی، ویسی ہی قوم ہمارے سامنے ہے۔

مسئلے کا حل

اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ وہ یہ کہ قوم کی تربیت کو کرنے کا ایک اہم کام سمجھا جائے۔ یہ چونکہ ایک طویل المدتی کام ہے، اس لیے ضروری ہے کہ کچھ لوگ اپنی زندگی اس کام کے لیے وقف کریں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو سیاست اور میڈیا کی چمکتی دمکتی دنیا میں فروخت کرنے کے بجائے اپنی دلچسپی اور شوق کے میدان میں عوام کی تربیت کرنے کو اپنا ہدف بنائیں۔ کچھ لوگ بنیادی تعلیم کو مسئلہ بنائیں۔ کچھ لوگ اخلاق اور اقدار کے فروغ کے لیے کام کریں۔ کچھ لوگ مذہبی، سیاسی اور قانونی میدانوں میں اصلاحی رویوں کی نشاندہی کو اپنی زندگی کا ہدف بنائیں۔

جب کچھ اعلیٰ ذہانتوں کے افراد ان چیزوں کے لیے کام شروع کریں گے تو زیادہ نہیں بس

ایک نسل میں صورتحال بہت بہتر ہو جائے گی۔ ورنہ لوگ لاکھ قانون سازی کرتے رہیں، لاکھ سیاست کے میدان میں زور آزمائی کرتے رہیں، لاکھ میڈیا شوز میں تقریریں اور تبصرے کرتے رہیں، ہماری صورتحال خراب سے خراب تر ہوتی چلی جائے گی۔

اس عاجز نے اپنی کتاب ''عروج وزوال کا قانون اور پاکستان'' لکھتے ہوئے صورتحال کی حقیقی خرابی کا اندازہ کرلیا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ خود کو پبلک اور میڈیا کی دنیا سے الگ کرتا چلا گیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ تربیت کا کام اپنی حقیر استعداد کے مطابق شروع کر دیا ہے۔ مگر چند برسوں ہی میں جو مثبت نتائج سامنے آئے ہیں اس سے بہت ہمت بندھی ہے۔ چنانچہ اب ایمان واخلاق کی دعوت وتربیت کے علاوہ خالص انسانی بنیادوں پر چھوٹے بچے بچیوں سے لے کر ماں بن جانے والی بچیوں تک کی عمر کو چار مراحل میں تقسیم کر کے ان کی تربیت کا ایک پروگرام پیش نظر ہے۔ انشاء اللہ اگلے دو عشروں میں اللہ نے چاہا تو ہم ایک بہتر قوم بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہماری قوم کا پوٹینشل بہت زبردست ہے۔ بہت مخلص، اچھے اور دردمند لوگ یہاں موجود ہیں۔ اور لوگ بھی اپنی اپنی جگہ یہ کام کریں تو آئندہ آنے والے برسوں میں انشاء اللہ صورتحال بہت بہتر ہو جائے گی۔

جہاں رہیے، بندگان خدا کے لیے رحمت بن کر رہیں، باعث زحمت نہ بنیے۔

جن انسانوں کی انا بہت مضبوط ہوتی ہے
ان کی شخصیت اکثر بہت کمزور رہ جاتی ہے

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (48)

مطالبات: اخلاقی مطالبات

اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عائد کردہ مطالبات

اخلاقی مطالبات میں سب سے اہم اور پہلا مطالبہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عائد کردہ مطالبات ہیں۔ ان مطالبات کو سامنے رکھنے کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی پہلو سے کسی مخلوق کے محتاج ہیں۔ قرآن مجید اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ستودہ صفات، بزرگ و برتر، غنی و بے نیاز، احد وصمد ہے۔ کوئی مدد و تعاون تو درکنار وہ اپنی عبادت، تعریف اور شکر گزاری کے بھی ضرورت مند نہیں۔ مخلوق سے یک طرفہ طور پر ان کا تعلق عطا و بخشش کا ہے۔ مخلوق عدم تھی، انھوں نے اسے وجود دیا۔ مخلوق مردہ تھی، انھوں نے اسے زندہ کیا۔ مخلوق محتاج مطلق ہے اور وہی ہیں جو مخلوق کی ہر ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔ مخلوق جب نہیں تھی، وہ تب بھی تھے اور اگر نہیں ہوگی، تب بھی وہ باقی رہیں گے۔

یکطرفہ عطا و بخشش کا یہی وہ تعلق ہے جو ان مطالبات کا باعث بنتا ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گرچہ خدا کو کسی چیز کی بھی حاجت نہیں، مگر انسان کی اخلاقی حس بہر حال یہ مطالبہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اسے سب کچھ دیا اور دیتا چلا جا رہا ہے، وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔ نیز انسان کے اندر موجود روحانیت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ کسی رب کو پوجے۔ یہ رب، اللہ رب العالمین کے سوا کوئی اور نہیں۔ قرآن مجید کے آغاز میں بیان کردہ سورہ فاتحہ اسی حقیقت کا بیان ہے کہ انسان کی اخلاقی حس جس ہستی کا شکر ادا کرنا چاہتی ہے اور اس کی

روحانیت جس ہستی کی پرستش کرنا چاہتی ہے وہ اللہ رحمٰن اور رحیم کی ہستی ہے۔

قرآن مجید اس انسانی تقاضے کو عبادت یا بندگی کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔ اس بندگی میں پرستش بھی شامل ہے، اطاعت بھی ہے اور حمیت وحمایت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ انسان جس کی بندگی کرے گا، اس سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے کچھ نہ کچھ مراسم عبودیت بھی اختیار کرے گا، یہ پرستش ہے۔ وہ ہستی چونکہ اِلٰہ ہونے کے ساتھ بادشاہ بھی ہے اس لیے اس کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ پھر اس کے ساتھ وہ ہستی چونکہ انسانوں کا رب اور ان کا مالک بھی ہے، اس لیے فطری طور پر انسان اپنے مالک کی حمیت وحمایت میں کھڑا ہوتا ہے اور جب موقع آتا ہے، اس کے لیے جان بھی دے دیتا ہے۔ قرآن مجید جس سورت پر ختم ہو رہا ہے یعنی سورۃ الناس وہ اللہ تعالیٰ کی انھی تین حیثیتوں کا تعارف ہے کہ وہ بیک وقت انسانوں کا رب یا مالک، ملک یا بادشاہ اور ان کا اِلٰہ یا معبود ہے۔ گویا قرآن مجید کا آغاز اور اختتام وہ اساسات بیان کر رہا ہے جن کی بنا پر خدا کے حوالے سے انسانوں پر عائد اخلاقی مطالبات کی وجہ سامنے آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عائد کردہ مطالبات گرچہ لازمی اور قانون کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے وہ شرعی مطالبات میں بھی زیر بحث آئیں گے، مگر مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر وہ اخلاقی بنیادیں بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حوالے سے بیان کردہ بعض مطالبات کو اخلاقی مطالبات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ مطالبات سب کے سب عبادات سے متعلق ہیں۔ ہم اخلاقیات کی اس بحث میں انھی عبادات کو زیر بحث لائیں گے، تاہم یہاں ان کا قانون نہیں بلکہ روح زیر بحث آئے گی۔ ان کا قانون شرعی مطالبات کے ذیل میں بیان ہوگا۔ عبادات کی اس روح میں ان کی حقیقت اور ان کا مقصد دونوں انشاء اللہ تفصیل سے زیر بحث آئیں گے۔

تاہم عبادات سے پہلے اخلاقی مطالبات کے ضمن میں قرآن مجید جس بات کو زیر بحث لاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ یہ گویا کہ خدا کے حوالے سے کیا گیا سب سے پہلا اور بنیادی اخلاقی مطالبہ ہے۔ ہم اخلاقی مطالبات کا آغاز اسی سے کرتے ہیں۔

شرک سے پرہیز

شرک وہ سب سے پہلی اور بنیادی آلودگی ہے جو انسانوں کو امتحان کی اس دنیا میں لاحق ہوئی اور ہر دور میں سب سے بڑھ کر انسانیت اسی ناپاکی کا شکار رہی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں یہی دعوت عبادت رب انبیا علھیم السلام کی بنیادی دعوت رہی اور قرآن مجید کی اصل دعوت بھی اسی مرکزی نقطے کے اردگرد گھومتی ہے۔ تاہم ہر دور میں چونکہ نبیوں کو ماننے والی امتیں بھی شرک کا شکار ہوتی رہیں، اس لیے قرآن مجید نے مزید یہ اہتمام کیا کہ مطالبات کے ضمن میں بھی ہمیشہ آغاز اسی نقطے سے کیا کہ خدا ہی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک بنا کر اس کی عبادت نہ کی جائے۔

شرک کی روح اور اس کی اساس

عقل وفطرت، علم وفکر، انبیا وصلحا کی دعوت میں کبھی شرک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ انسانی عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی۔ اس کی فطرت بھی اس کے خلاف کھڑی ہے۔ علم وفکر کے مسلمات میں کبھی کوئی چیز ایسی سامنے نہیں آئی جو کسی غیر اللہ کے لیے عبادت کا کوئی قرینہ ثابت کر سکے۔ انبیا اور صلحا کی دعوت بھی ایسے کسی تصور سے ہمیشہ خالی رہی ہے۔ تاہم جو چیز انسانوں کو ہمیشہ شرک کی طرف لے کر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا پردہ غیب میں پوشیدہ ہے۔ خدا جتنا بھی عزیز وقدیر ہو وہ بہرحال کبھی سامنے نہیں ہوتا۔ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ سن نہیں سکتا۔ چھو نہیں سکتا۔ وہ اپنی مرضی تو انسانیت تک پہنچاتا ہے، مگر کسی نافرمانی پر عام طور پر ردعمل کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ اُس

کے وعدے اگلی دنیا کے وعدے ہیں اوراس کی وعیدیں آنے والی دنیا کی وعیدیں ہیں۔ظاہر ہے کہ ایمان بالغیب کا یہ مطالبہ امتحان کی بنا پر کیا گیا ہے کہ خدا اگر سامنے آجائے تو پھر اس کی کسی نافرمانی کا کوئی سوال ہی نہیں۔مگر ظاہر پرستی کی یہی انسانی کمزوری ہے جو ہر دور میں شرک کا باعث بنی ہے۔اس کے بارے میں اقبال نے بالکل ٹھیک کہا ہے:

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
پوجتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

چنانچہ انسانوں نے بت تراشنے شروع کیے جو اپنی تمام تر بے وقعتی کے باوجود انسان کی نظر کے سامنے ہوتے ہیں۔انسانوں نے روحوں ،فرشتوں اور جنوں کو پکارنا شروع کیا کہ خدا کے برعکس جس کی ہستی کا کوئی تصور ممکن نہیں،ان کا بہر حال کوئی نہ کوئی تصور تو کیا ہی جا سکتا ہے۔اس نے قبروں کو سجدہ شروع کیا کہ مرنے والے مردہ سہی مگر سامنے قبر تو بہر حال موجود ہے۔اس نے شمس وقمر،شجر وحجر اور جانوروں تک کو اس وجہ سے پوجنا شروع کیا کہ اس کی نگاہیں ان کا ادراک تو کر سکتی ہیں۔برخلاف اس خدائے رحمٰن کے کہ نگاہیں اس کے ادراک ہی سے عاجز ہیں۔یوں وہ شرک وجود میں آیا جو خدا کی ذات،صفات اور اختیارات میں کسی اور کو شریک یا اس کا ہم سر ماننے کا نام ہے۔اس شرک میں لوگ غیر اللہ کو خدا کی ذات کا حصہ سمجھتے ہیں جیسے مسیحی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔یا پھر خدا کی صفات اور اختیارات میں دوسروں کو حصہ دار سمجھ کر ان سے دعا و استمداد اور عبادت کا تعلق پیدا کرتے ہیں۔جیسے بتوں کی پرستش،غیر اللہ سے مرادیں اور مدد مانگنا وغیرہ۔ظاہر ہے کہ استمداد و پرستش کا یہ تعلق اسی بنیاد پر قائم ہوتا ہے کہ یہ ہستیاں خدا کی طرح غیب کا علم رکھتی اور دنیا وآخرت کے معاملات میں ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہیں۔قرآن مجید ان تمام تصورات کی نفی سے بھرا ہوا ہے۔

شرک جدید

انسانوں کی یہ ظاہر پرستی زمانہ قدیم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ دور جدید میں جب کہ سائنس نے اس کائنات میں ہر جگہ انتہائی نازک، پیچیدہ اور بامقصد قوانین دریافت کر لیے ہیں جن کے بارے میں کوئی احمق ہی یہ تصور کرسکتا ہے کہ یہ خود بخود وجود میں آگئے ہیں، انسانیت شرک کے ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے، جسے الحاد کہا جاتا ہے۔ الحاد بظاہر انکار خدا ہے۔ مگر خدا کا انکار کیا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ دور جدید میں انسان نے مدر نیچر کے نام سے ایک نئی دیوی تراشی ہے جس سے منکرین خدا وہ سارے کام لیتے ہیں جن کے لیے مذہبی لوگ خدا کا نام لیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کائنات میں اس درجہ کی حسابی قطعیت ہے، ایسا محکم نظم ہے، ایسی مقصدیت اور حکمت ہے کہ اسے اتفاقات کی کسی زنجیر کا نتیجہ قرار دینے کے لیے انسان کو اپنی عقل اور فطرت دونوں کو کونے میں رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ لوگ کرنے کو انکار خدا تو کر دیتے ہیں، مگر وہ سارا کریڈٹ نیچر کے قوانین کو دے دیتے ہیں، جو اصل میں خدا کی حمد اور شکر گزاری کا باعث بننا چاہیے۔ یہی پس منظر ہے جس میں ہم نے الحاد کو بھی شرک ہی کی ایک جدید قسم میں شمار کیا ہے۔

تاہم قرآن مجید بالکل واضح ہے کہ شرک ظلم عظیم ہے اور اس کے مرتکب کے پاس عقل و نقل کی کوئی دلیل نہیں۔ یہ صرف ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے اور یہ اتنی بڑی حق تلفی ہے کہ اس کا بدلہ جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف جو لوگ ایمان لاتے ہیں، قرآن مجید نے اپنے آغاز ہی میں یہ بتا دیا ہے کہ وہ غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ مومن عقلی اور فطری دلیل کو کافی سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کو دیکھ کر ماننا امتحان کی دنیا میں ممکن نہیں اور اس کا مطالبہ کرنا اپنی مہلت عمل ختم کرنے کے مترادف ہے۔

قرآنی بیانات

''اے لوگو! تمھی اللہ کے محتاج ہو، اللہ تو بے نیاز وستودہ صفات ہے۔'' (فاطر 35 :15)

''اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب وحکیم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' (الحدید 57 :3-1)

''شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا وسزا کے دن کا مالک۔'' (فاتحہ 1 :3-1)

''کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی'' (الناس 114 :3-1)

''اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار پڑوسی، بیگانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (النسا 4 :36)

''اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے، تکبر سے اینٹھتے ہوئے، حجتیں کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے برگشتہ کریں۔'' (الحج 22:9-8)

''اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں ناشکری کرو گے تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے اور وہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔'' (ابراہیم 14 :8)

''یہ الف، لام، میم ہے۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' (البقرۃ 2 :3-1)

''اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔'' (انعام 6 :103)

''بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔'' (سورۃ لقمان31 :13)

''بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

(سورۃ النساء4 :116)

''کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتی ہیں۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھارے ساتھ نہ لگیں گے، یکساں ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہہ دو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، میرے خلاف چالیں چل دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو۔'' (سورۃ الاعراف7 :195-191)

''اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

(سورۃ القصص28 :88)

''اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور (انہوں نے) اس (خدا) کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔'' (سورۃ انعام6 :100)

''اور جو نہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود پکارتے ہیں اور نہ اس جان کو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا بغیر کسی حق کے قتل کرتے اور نہ بدکاری کرتے اور جو کوئی ان باتوں کا مرتکب ہوگا وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوگا۔ قیامت کے دن اس کے عذاب میں درجہ بدرجہ اضافہ کیا جائے گا اور وہ اس میں خوار ہو کر ہمیشہ رہے گا۔'' (سورۃ الفرقان25 :69-68)

''اے لوگو! ایک تمثیل بیان کی جاتی ہے تو اس کو توجہ سے سنو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں۔

اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں! انھوں نے اللہ کی، جیسا کہ اس کا حق ہے، قدر نہیں پہچانی! بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔'' (سورۃ الحج 22 :74-73)

''اور کہو کہ شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی حاجت ہے اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔'' (سورۃ بنی اسرائیل 17 :111)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ رحمان و رحیم ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سُکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور، صاحبِ کبر۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا۔ اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔'' (سورۃ الحشر 59 :24-22)

سوال و جواب

ابویحییٰ

حوروں کی خاص اٹھان کا مطلب

سوال: عزیز بھائی! جب زندگی شروع ہوگی بہت زبردست کتاب ہے، ماشاءاللہ۔ ایک بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ کتاب میں ذکر کیا گیا ہے کہ جنت کی حوریں بھی انسان ہی ہیں مگر سورہ واقعہ کی آیت 35 میں ہے کہ ہم نے انہیں خاص طور پر پیدا کیا ہے۔ اس کی وضاحت فرما دیں۔ شکریہ۔ حافظ مطیع اللہ

جواب: السلام علیکم

کتاب کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو اس میں دو چیزوں کو سمجھ لینا چاہیے۔ پہلی یہ کہ لفظ حور انسان سے مختلف کسی خاص مخلوق کا نام نہیں بلکہ خواتین کی ایک صفت کا بیان ہے۔ یعنی وہ خواتین جن کی نگاہوں کی سفیدی بہت سفید اور سیاہی بہت سیاہ ہوگی۔ ان کو حور عین بھی کہا گیا ہے یعنی بڑی بڑی آنکھوں والی آہو چشم خواتین۔ بعض اہل علم اس تعبیر کا ترجمہ بڑی بڑی آنکھوں والی گوریوں کے طور پر بھی کرتے ہیں۔ یعنی ان کا رنگ بہت گورا اور آنکھیں بہت بڑی ہوں گی۔ یہ خوبصورتی کو بیان کرنے کا ایک کنایہ ہے۔ چنانچہ یہ اسم صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے جسے غلطی سے بعض لوگ اسم جنس سمجھ لیتے ہیں۔ اس ساری بات کا سادہ مطلب یہ ہے کہ یہ خواتین کی خوبصورتی کا بیان ہے نہ کہ کسی قسم کی مخلوق کا بیان ہے۔

قرآن مجید کی سورہ دخان میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یہ بیان فرمایا ہے کہ ہم ان اہل جنت کو آہو چشم حوروں سے بیاہ دیں گے۔

وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ (الدخان 44: 54)

چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حوروں کی حیثیت اہل جنت کی بیویوں کی ہوگی۔ بیوی اگر اپنی جنس کی نہ ہو یعنی انسان نہ ہو تو رفاقت کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ یہ کسی اور قسم کی مخلوق ہوں گی درست نہیں۔

جہاں تک سورہ واقعہ کی آیت کا تعلق ہے تو پوری بات درج ذیل ہے۔

إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً (35) فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَاراً (36)

یعنی ہم نے ان خواتین کو ایک ایسی خاص اٹھان پر اٹھایا ہے کہ وہ ہمیشہ کنواریاں رہیں گی۔ گویا خاص طور پر پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس اہتمام سے پیدا کیا ہے کہ بیوی ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ کنواری رہیں گی۔ ظاہر ہے کہ موجودہ جسم میں تو یہ ممکن نہیں۔ اسی لیے اسے خاص طور پر بنانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ میرے نزدیک اس بات کا مطلب ہے۔ حقیقیعلم اللہ ہی کے پاس ہے۔

جاوید چوہدری

ترقی چیونٹی کے پاؤں لے کر پیدا ہوتی ہے

وہ مزدور کا مقدر لے کر پیدا ہوا تھا لیکن اس نے اپنے وژن، محنت اور ایمانداری سے اپنا مقدر بدل دیا، وہ 2007ء میں دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص بن گیا۔

وہ 1926ء میں سویڈن کے ایک گاؤں (Agonnaryd) میں پیدا ہوا، اس کے والدین ایک فارم ہاؤس ایلمٹر یاڈ (Elmtaryd) میں مزدوری کرتے تھے۔اس کے والدین نے پانچ برس کی عمر میں اسے بھی مزدوری پر لگا دیا لیکن اس نے مزدوری کے بجائے کاروبار کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام تین سال کی عمر میں رکھا گیا، اس کے نام کے دو حصے تھے انگوار اور کیمپارڈ۔اس نے گیارہ سال کی عمر میں ماچسیں بیچنا شروع کیں، وہ ماچسوں کے ڈبے لیتا اور سائیکل پر گلی گلی ماچسیں بیچتا رہتا، وہ یہ کام چھ ماہ تک کرتا رہا پھر ایک دن اسے معلوم ہوا اگر وہ شہر سے تھوک میں ماچس خرید لے اور یہ ماچس گاؤں کے دکانداروں اور پھیری بازوں کو بیچ دے تو وہ زیادہ منافع کما سکتا ہے۔انگوار اگلے دن اسٹاک ہوم چلا گیا اور وہاں سے تھوک میں ماچس خرید لایا، اس نے یہ ماچسیں تھوڑا سا منافع رکھ کر بیچ دیں، اس نے اگلے سال تک ماچسوں کے کاروبار کو مچھلی، کرسمس ٹری، کرسمس کارڈز، پھولوں کے بیج، بال پوائنٹس اور پینسلوں تک پھیلا دیا، وہ یہ ساری اشیاء تھوک میں خریدتا تھا اور بعد ازاں گاؤں کے دکانداروں کو فروخت کر دیتا تھا، وہ 17 سال کا ہوا تو اس کے والد نے اسے تھوڑے سے پیسے دیے۔اس نے اس معمولی سی رقم سے ایک ایسی کمپنی کی بنیاد رکھ دی جس نے آنے والے دنوں میں پوری دنیا کا لائف اسٹائل تبدیل کر دیا۔انگوار نے اس رقم سے وزن میں ہلکا لیکن رنگوں میں تیز فرنیچر بنانا شروع کر دیا، لوگوں کا خیال تھا اس کا آئیڈیا ناکام ہو جائے گا کیونکہ اس وقت لکڑی کے بھاری بھرکم فرنیچر کا رواج تھا،

لوگ ایک مرتبہ فرنیچر بنواتے تھے اور یہ فرنیچر تین نسلوں تک ان کا ساتھ دیتا تھا۔ چنانچہ اس وقت یورپ میں فرنیچر ایک ایسی پراڈکٹ سمجھا جاتا تھا جس کی مانگ نہ ہونے کے برابر تھی، اس وقت تک فرنیچر کے اسٹورز اور شورومز بھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ لوگ ترکھانوں سے اپنی ضرورت کا فرنیچر بنوا لیتے تھے لیکن انگوار نے فرنیچر کو کاروبار کی شکل دینے کا فیصلہ کیا، اس کا خیال تھا آنے والے دنوں میں پوری دنیا میں نقل مکانی شروع ہو جائے گی، لوگ روزگار کے لیے آبائی شہروں سے باہر نکلیں گے، لہٰذا اس نقل مکانی کے دوران بھاری فرنیچر کی نقل و حمل مشکل ہو جائے گی۔ اس کا خیال تھا مستقبل قریب میں بڑے شہروں پر آبادی کا دباؤ بڑھ جائے گا جس کے نتیجے میں مکانوں اور فلیٹوں کا سائز چھوٹا ہو گا۔ چنانچہ لوگوں کو چھوٹے سائز کے مکانوں کے لیے فرنیچر بھی چھوٹے سائز کا چاہیے، اس کا خیال تھا کہ مستقبل کا دور رنگوں کا ہو گا، آنے والے دنوں میں ہر چیز رنگین ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے ان تمام امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اکیا (ikea) کے نام سے یورپ میں فرنیچر سازی کی پہلی کمپنی کی بنیاد رکھی۔ اکیا ایک لایعنی لفظ تھا، یہ چار حروف آئی، کے، ای اور اے کا مجموعہ تھا۔ اس نے چار حرف اپنے نام اور اپنے گاؤں سے لیے تھے، آئی اس کے نام انگوار کو ظاہر کرتا تھا، کے سے مراد کیمپارڈ تھی، ای کا تعلق اس فارم ہاؤس ایلمٹر یاڈ سے تھا، جس میں اس نے پرورش پائی تھی اور اے اس کے آبائی گاؤں Agunnaryd کا پہلا حرف تھا۔ انگوار نے جب اپنی کمپنی کا نام اکیا رکھا تو لوگوں کا خیال تھا اس کے بزنس کی طرح اس کی کمپنی کا نام بھی لایعنی ہے لہٰذا یہ کاروبار اور یہ کمپنی چند ماہ میں ماضی کا قصہ بن جائے گی لیکن انگوار نے آنے والے دنوں میں لوگوں کے سارے خدشات باطل ثابت کر دیے۔ اس نے سائز میں چھوٹا، وزن میں ہلکا اور رنگوں میں تیز فرنیچر بنوایا اور یہ فرنیچر آنے والے دنوں میں دنیا کا لائف اسٹائل بن گیا، اس نے دنیا کی نفسیات اور طرز رہائش بدل کر رکھ

دی۔ اکیا بیس برس بعد یورپ کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی، اس کی یہ کامیابی اس کے وژن، محنت اور ایمانداری کا نتیجہ تھا، اس نے وقت کی تبدیلی کو بھانپ لیا تھا، وہ سمجھ گیا تھا چھوٹی اور کارآمد چیزوں کا دور آنے والا ہے لہٰذا مستقبل میں صرف وہی چیزیں کامیاب ہوں گی جو سائز میں چھوٹی، وزن میں ہلکی اور استعمال میں وسیع ہوں گی۔ 1980ء میں اس نے اپنے بزنس کو ایک اور کروٹ دی، اس نے گھر میں استعمال ہونے والی ہر قسم کی مشینری بنانا شروع کر دی، وہ اس وقت کچن میں استعمال ہونے والی چھوٹی چمچ سے لے کر گھر میں استعمال ہونے والے باتھ ٹب تک ہر چیز بنا رہا ہے۔ اس کا کاروبار یورپ سے لے کر امریکا تک اور دبئی سے لے کر نیوزی لینڈ تک دنیا کے 34 بڑے ممالک میں پھیلا ہوا ہے، اس کے اسٹورز پر روزانہ 900 ملین ڈالر کی سیل ہوتی ہے اور آج یہ کہا جاتا ہے یورپ میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں اکیا کی کوئی نہ کوئی چیز موجود نہ ہو۔ مارچ 2007ء میں فوربس انٹرنیشنل نے مزدور کے اس بیٹے کو دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص قرار دیا تھا جب کہ جون 2015ء میں Bloomberg Billionaires Index نے اسے دنیا کا آٹھواں امیر ترین شخص قرار دیا، اس وقت اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں 43 بلین ڈالر جمع ہیں جب کہ اس کی دولت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

انگوار کیمپارڈ ایک انتہائی دلچسپ شخص ہے، وہ ارب پتی ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گزارتا ہے، وہ پندرہ سال پرانی والوو گاڑی استعمال کرتا ہے، اپنی گاڑی خود چلاتا ہے، ہمیشہ جہاز کی اکانومی کلاس میں سفر کرتا ہے۔ اس نے سات سال کی عمر میں کرسمس پیپر بیچنے کا کام شروع کیا تھا وہ اب تک یہ کاروبار کر رہا ہے، وہ ہر سال کرسمس پیپر خریدتا ہے اور کرسمس کے بعد ان پیپرز کی سیل لگاتا ہے۔ اس نے اکیا کے تمام ملازمین کو کاغذ کی دونوں سمتیں استعمال کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ اس کے کسی دفتر میں اگر کوئی شخص ایک سمت استعمال کر کے کاغذ ردی کی

ٹوکری میں پھینک دے تو وہ لڑنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔وہ ہمیشہ سستے ریستورانوں میں کھانا کھاتا ہے، اس نے چالیس برس قبل اکیا کے دفاتر اور فیکٹریوں میں ملازموں کے لیے سستا کھانا شروع کرایا تھا، وہ اگر کھانے کے وقت اپنی کسی فیکٹری یا دفتر کے نزدیک ہو تو وہ ہمیشہ اکیا کے کیفے ٹیریا میں کھانا کھاتا ہے اور دو تین ڈالر، پاؤنڈ، مارک یا کراؤن بچا کر خوش ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی فراخ دل شخص بھی ہے، اس نے INGKA Foundation کے نام سے ایک فلاحی ادارہ بنا رکھا ہے۔وہ اس ادارے کے ذریعے اب تک 36 بلین ڈالر کی چیرٹی کر چکا ہے، دنیا کے نامور میگزین اکانومسٹ کے مطابق انگوار فلاح عامہ میں بل گیٹس کے مقابلے میں کہیں زیادہ رقم خرچ کرتا ہے لیکن وہ اپنی چیرٹی کے تمام کاموں کی تشہیر نہیں کرتا لہٰذا دنیا اس کی خیرات اور فلاحی کاموں سے پوری طرح واقف نہیں۔اگر انگوار کیمپارڈ کی ذات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک کنجوس سخی محسوس ہوتا ہے، وہ ایک طرف اپنے کسی ورکر کو ایک پنسل تک ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔وہ کاغذ کی دوسری پرت ضائع کرنے کے جرم میں اپنے ایم ڈی تک کو فارغ کر دیتا ہے جب کہ دوسری طرف وہ اربوں کھربوں ڈالر خیرات کر دیتا ہے، وہ شاید اس وقت دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص ہوگا۔

مجھے انگوار کا ایک انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس انٹرویو میں اس نے دو دلچسپ باتیں کیں۔اس نے بتایا کہ دنیا میں نوکری کرنے والا کوئی شخص خوشحال نہیں ہو سکتا، انسان کی معاشی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔اس کی دوسری بات اس سے بھی دلچسپ تھی، اس کا کہنا تھا کامیابی اور ترقی کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔اس کا کہنا تھا اگر تعلیم سے روٹی کمائی جا سکتی تو آج دنیا کے تمام پروفیسر ارب پتی ہوتے۔اس کا کہنا تھا اس وقت دنیا میں ساڑھے نو سو ارب پتی ہیں لیکن ان میں ایک بھی پروفیسر، ڈاکٹر یا ماہر تعلیم شامل نہیں۔اس کا

کہنا تھا دنیا میں ہمیشہ درمیانے پڑھے لکھے لوگوں نے ترقی کی، یہ لوگ وقت کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں، چنانچہ یہ لوگ ڈگریاں حاصل کرنے کے بجائے طالب علمی کے دور ہی میں کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کامیابی انھیں کالج یا یونیورسٹی سے اسٹور، کارخانے یا منڈی میں لے جاتی ہے۔ اس کا کہنا تھا وہ زندگی میں کبھی کالج نہیں گیا لیکن اس وقت اس کی کمپنی میں 30 ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین وحضرات کام کر رہے ہیں۔ یہ تعلیم یافتہ لوگ وژن، علم اور دماغ میں اس سے کہیں بہتر ہیں، بس ان میں ایک خامی تھی، ان میں نوکری چھوڑنے کا حوصلہ نہیں تھا، انھیں خود پر اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا اگر کوئی شخص انگوار کے لیے کام کر سکتا ہے تو وہ خود اپنے لیے بھی کام کر سکتا ہے، بس اس کے لیے ذرا سا حوصلہ چاہیے۔ اس نے دنیا بھر کے نوجوانوں کو پیغام دیا، ترقی چیونٹی کے پاؤں لے کر پیدا ہوتی ہے لیکن جوان ہونے تک اس کے پاؤں ہاتھی جتنے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا دنیا میں ہر چیز کا متبادل موجود ہے لیکن محنت کا کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ اس نے کہا دنیا کا کوئی کیمیائی عمل لوہے کو سونا نہیں بنا سکتا لیکن انسانی ہاتھ وہ طاقت ہیں جو دنیا کی کسی بھی دھات کو سونے میں بدل سکتے ہیں۔ اس نے کہا دنیا میں نکمے لوگوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں جب کہ کام کرنے والوں کے لیے پوری دنیا کھلی پڑی ہے۔ اس نے کہا ہنر مند شخص کا ہنر اس کا پاسپورٹ ہوتا ہے۔ میں نے جب انگوار کے یہ خیالات سنے تو میں نے سوچا کاش میں یہ خیالات پاکستان کے ان تمام بے روزگار نوجوانوں تک پہنچا سکوں جو دن رات بے روزگاری کا رونا روتے رہتے ہیں، کاش میں ان نوجوانوں کو بتا سکوں اگر فارم ہاؤس کا ایک مزدور مسلسل محنت سے انگوار بن سکتا ہے تو پاکستانی نوجوانوں کے راستے میں کیا رکاوٹ ہے؟ یہ لوگ کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے، انگوار نے کہا تھا آگے بڑھنے کا راستہ انھیں ملتا ہے جو چلنا جانتے ہیں میرا خیال ہے ہمارے نوجوانوں کو چلنے کا ہنر نہیں آتا۔

عثمان حیدر

تنقید اور ادب

اصلاح اور تربیت کے سبھی راستے ادب کی وادی سے ہی گزرتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ اصلاح اور تربیت کے طیور چشمہ ادب پر ہی وارد ہوتے اور اسی سے اڑان بھرتے ہیں۔

اب ادب کی ''سمت'' کیا ہے، اس کا تعلق بھی اصلاح اور تربیت کی ''سمت'' پر منحصر ہے کہ جس پیرائے میں اصلاح درکار ہوگی، اسی پیرائے میں بڑوں کے نظریات میں غلطیوں کی نشان دہی کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بشری تقاضوں کے تحت بڑوں سے جو تسامحات ہوئے ہیں ان سے صرف نظر کیا جائے گا اور مرض کی نشان دہی نہیں کی جائے گی۔ بس نشان دہی بقدر مرض کی جائے گی اور طرز تنقید ایسا اپنایا جائے گا کہ جس سے ان کی شخصیت مجروح نہ ہو اور اسی پیرائے میں ان کی خدمات سے بالکلیہ انکار کا رجحان اور ذہن پیدا نہ ہو۔

یہ بات کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ بہت سے احباب بغرض اصلاح وتربیت جب متقدمین کے باب میں مبالغہ آرائی اور اندھی تقلید کی بیخ کنی کرتے ہیں تو لاشعوری طور پر وہ خود تنقید میں افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نیز اس سے عام قاری جو ان کے نام سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہوتا، ان کی بے ادبی کا مرتکب ہوتا ہے اور ان کو جائز مقام دینے میں بھی ناکام رہتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس طرح کی تنقید سے اصلاح وتربیت کا مقصد پورا ہونے کے بجائے مخاطبین کی طرف سے بحث ومباحث کا آغاز ہو جاتا ہے جس میں وہ اپنے اکابرین کی طرفداری کرتے ہوئے مزید شد ومد کے ساتھ ان کی اندھا دھند پیروی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

فرح رضوان

بوجھ

صبح بلکہ علی الصباح، نینداس جھماکے سے اڑی کہ گیزر کام نہیں کررہا، جی بھر کے ٹھنڈے پانی سے وضوکا ثواب اٹھایئے۔ خیر وقوعہ کی کھوج لگائی تو جائے وقوعہ پر بڑے بیٹے صاحب کا بڑا سا کارنامہ موجود پایا کہ اپنے کسی پراجیکٹ کے لیے اس نے الیکٹرک گیزر والے ساکٹ میں، ''حسب استطاعت وضرورت'' ڈھیروں مزید پلگ لگالگا کر کام کیا تھا، گیزر والا کنیکشن کب ٹرپ ہوا کسی کو خبر بھی نہ لگی۔ خیر جناب اس کا سادہ ساحل یہ کیا کہ بوجھ کو تقسیم کر دیا تاکہ مزید ''ضرب'' سے محفوظ رہ سکے۔

ایسا ہی تو ہوتا ہے نا! ہر گھر، دفتر، ادارے، وغیرہ وغیرہ میں، جہاں بھی چار چھ لوگ مل کر رہیں، وہاں ایک سیدھا سادہ، بے زبان سا بندہ سب کی خاموش آزمائش بنا ہوتا ہے۔ خواہ والدین ہوں، بہن بھائی، خواہ ازواج ہوں یا ان کے سسرال یا پھر کولیگز اور ساتھی، اس ایک بڑے ہی کام کے اور انکار نہ کرسکنے والے، پلٹ کر جواب نہ دینے والے شخص کے اوپر اسی قسم کا اخلاقی دباؤ بنائے رکھتے ہیں تاوقتیکہ اسکا صبر ٹرپ کر جائے۔ لیکن پھر شکوہ بھی سب کو اسی سے ہوتا ہے کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا۔

ارے! بوجھ بھی تو دیکھیں نا کہ کس قدر ذمہ داریاں آپ نے ایک ہی بندے پر لاد دیں تھیں۔ جو خاموشی سے ثواب جان کر آپ کا کام کرلیا کرے اس پر کام کا بوجھ، جو مالی مدد کرسکے اس پر فائنینشل دباؤ، جو آپ کی سر پھری ناسمجھ باتوں کو خاموشی کی مصلحت میں لپیٹ کر رکھ دینے کا عادی ہو، اس پر اپنے حقوق کی تسلسل سے ڈو مور ڈیمانڈ کا بوجھ، جو شادی کے معاملات پر زیادہ نہ بولے، اس کی شادی کہیں بھی کر کے یا سرے سے نہ کر کے نفسیاتی دباؤ کا بوجھ اور اگر آپ کو

مزے مزے کے کھانوں کا شوق ہے تو پکوانوں کی بے دریغ فرمائشوں کا بوجھ اور اگر زبان سے کسی کے دل اور شخصیت کو چھلنی کرنے کا چسکا لگا ہے تو مقابل پر ہیجانی دباؤ کا بوجھ ہے۔ مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کل کو یہ سارا بوجھ پلٹ کر آپ پر آئے گا احتساب کی صورت میں۔

ایک قصہ یاد ہو شاید آپ کو تو اس سے سمجھیں، گدھے کا مالک نمک کی بوریاں لاد کر چھوٹی سی ندی کو پار کر رہا تھا کہ گدھے کا پاؤں پھسلا اور وہ پانی میں گر گیا، اٹھنے اٹھانے میں درکار وقت میں نمک گھل گیا تو گدھے کو لگا کہ اس کی تقدیر کھل گئی ہے۔ دوسرے دن جب سوداگر نے ندی پار کی تو گدھا جان بوجھ کر پھسل گیا، مگر اس وقت اس پر کپاس لدی ہوئی تھی، جوں ہی پانی لگا، وہ روئی کئی گنا بھاری بوجھ میں بدل گئی۔

اب مارل آف دا سٹوری کا اپنی زندگانی سے موازنہ کر کے دیکھیں کہ اصل میں آج ہمیں اپنا کام، ذمہ داری یا ناروا رویوں کا بوجھ دوسروں پر لاد کر خود کو ہلکا کرنے کا جو مزہ لگ گیا ہے کل کو یہ بوجھ کس کے کندھے پر، کتنے گنا بڑھ کر آ سکتا ہے؟

ثمر عمیر

اپنے آپ پر حکومت کریں

ایک صاحب اپنے کسی عزیز کے یہاں وفات کے موقع پر تعزیت کے لئے پہنچے۔ اہل خانہ سے دکھ کا اظہار کر کے ایک کرسی پر براجمان ہوئے۔ آج وہ ایک مضبوط ارادہ کر کے آئے تھے کہ میت کے گھر کھانا نہیں کھائیں گے۔ اس کے منفی پہلو پر سوچ بچار اور اہل علم سے معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہمارے یہاں اس سماجی برائی پر لوگ متوجہ نہیں ہیں کہ میت کے گھر لمبے چوڑے دستر خوان اور دعوت عام مرحوم کے گھر والوں پر کس قدر بوجھ اور اذیت کا باعث بن جاتی ہے۔ دیکھا جائے تو ہمارے یہاں ایک اخلاقی طرزِ عمل کو غیر اخلاقی رواج میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ پہلے زمانے میں میت کے گھر میں غم منانے کی صورت میں چولہا نہیں جلتا تھا اور آس پڑوس کے لوگ یا رشتے دار مل کر کھانے کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ لوگ بھی دور دراز سے آتے تھے یا انتہائی قریبی رشتے دار اہل خانہ کا غم ہلکا کرنے کے لئے کچھ دن ان کے ساتھ رہ لیتے تھے لیکن موجودہ تمدن میں عام طور پر ایسا نہیں رہا، البتہ کھانے کا اہتمام مزید زور پکڑتا جا رہا ہے۔ اس منفی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ان صاحب نے کھانے سے انکار کر دیا جس پر لوگوں کی طرف سے زوردار اعتراض بدتہذیبی کے ساتھ سامنے آیا مگر ان سب باتوں کے باوجود ان کے اخلاقی رویے اور ارادہ پر آنچ نہیں آئی بلکہ خاموشی سے بغیر کسی ردعمل کے انہوں نے وہاں سے نکلنے میں عافیت جانی۔ البتہ آخر تک شور کی آوازیں انہیں الوداع کرتی رہیں۔ یہ صاحب معاشرے کی ایک غلط روایت کو ختم کرنے چلے تھے۔ اگر پورا مجمع یا بھیڑ کسی غلط رخ پہ چل رہا ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ راہ راست پر ہیں۔ ایک تنہا شخص جب غلط روایات، رسم و رواج سے ٹکراتا ہے تو لوگ اعتراضات کا طوفان کھڑا کر دیتے ہیں، اور تلخ رویے اپناتے

ہیں لیکن اس سے گھبرا کر اپنا طرز عمل نہیں بدلنا چاہیے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ صحیح اور حق پر ہونے کے باوجود جب انسان کی عزت نفس پہ وار کیا جائے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے اور جوابی کاروائی کے طور پر کچھ نہ کچھ اگل ڈالتا ہے لیکن ایسی صورتحال میں ہی خود پر قابو رکھنے والا صبر کے بدلے اجر عظیم کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ انسان اگر کسی چیز کا ارادہ کر کے اس پر مضبوطی سے قائم رہے تو ضرورت، خواہش، غلط عادات، منفی رویے سب پر قابو پا سکتا ہے۔ صبر کرتے ہوئے اپنے نفس کے خلاف جانے کی مشقت کے لمحات زیادہ طویل نہیں ہوتے لیکن یہی لمحات آپ کی جنت یا جہنم بنا جاتے ہیں۔

جذبات کے وقتی ابال پہ قابو پا کر چند لمحات کا صبر آپ کو اخلاقی بیماریوں سے بچا لیتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جب ڈاکٹر کسی جسمانی بیماری سے شفا کے لیے انجکشن تجویز کرتا ہے تو اس کی چبھن کے مرحلے سے گزرنے کا سوچ کر ہی لوگوں کی اکثریت خوفزدہ رہتی ہے چاہے وہ بچے ہوں یا بڑے افراد۔ بعض تو خوب ہنگامہ کرتے ہیں جبکہ عام طور پر اس عمل میں کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوتی، کیونکہ انجکشن لگنے کا عمل صرف چند سیکنڈز کا ہوتا ہے۔ پہلے سے ذہنی طور پر تیار لوگ اس عمل کے دوران ہمت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ مرحلہ نسبتاً مشکل نہیں ہوتا۔ چند لمحات کا صبر یا کنٹرول آپ کو بیماری سے نجات دلا جاتا ہے۔ یہی حال اپنے غصہ یا دیگر خامیوں پر قابو پانے کے معاملے میں ہے۔ اپنی کمزوریوں پر بخوبی غلبہ پانا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہوتی بس عمل پر توجہ مرکوز ہو تو پختہ ارادہ بھی عمل میں ڈھل جاتا ہے۔ انسان جب اس بات کا تہیہ کر لے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اخلاقی اصولوں پر سودا کسی حال میں نہیں کرنا، نازک لمحات آنے سے پہلے ذہنی طور پر مستعد رہے نیز عمل کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا رہے تو یقیناً ہمارے اخلاق اور معاملات اعلیٰ اور زندگی کے ہر شعبے کا تزکیہ ایک حقیقت بن جائے گا۔ پختہ ارادہ آپ سے سب کچھ کروا دیتا ہے لیکن اس کے لیے صبر آزما مرحلے سے گزرنا شرط ہے۔

شاہ حسین

ذہنی دباؤ کیسے کم کیا جاسکتا ہے؟

انسان پریشان کیوں ہوتا ہے؟ انسان پر اختیاری اور غیر اختیاری مسائل کا دباؤ رہتا ہے۔ ہر دو قسم کے دباؤ سے بہت حد تک نکلا جاسکتا ہے لیکن ایسا اس وقت ممکن ہے جب ہم شعوری حالت میں جی رہے ہوں۔ سمجھنے کے لیے دباؤ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔اس تقسیم کے تناظر میں ہم اپنے احوال دیکھیں تو کسی قدر دباؤ کو کم کر سکتے ہیں۔

پہلی قسم کا دباؤ ایسا دباؤ ہے جو قدرتی طور پر پیش آنے والی آزمائشوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایسے دباؤ کو تعلق باللہ سے کم کیا جاسکتا ہے۔انسان عبادات بجالاتا رہے،صدقہ وخیرات اور ذکرو اذکار کرتا رہے۔اللہ اسے آزمائشوں اور قدرتی آفات سے محفوظ رکھے گا۔

دوسری قسم کا دباؤ ہماری اپنی مینجمنٹ کی وجہ سے ہے۔ہم اپنے معاشی، سماجی اور داخلی معاملات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ایک مصنوعی دباؤ سر لے لیتے ہیں۔اس قسم کے دباؤ سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی مینجمنٹ درست کرنے کی ضرورت ہے۔زندگی کو ایک نظام کی شکل میں چلائے جانے کی کوشش کی جائے اور مسائل کو اپنی نااہلی وغفلت سے الجھایا نہ جائے۔کام کو اس طرح مینج کیا جائے کہ دباؤ نہ رہے۔مثال کے طور پر پندرہ دن بعد آپ کوئی تقریب یا کوئی پراجیکٹ کرنے جارہے ہیں۔آپ ہماری عمومی روایت کے مطابق آخری تاریخ کا انتظار مت کریں۔ بروقت پراجیکٹ بنائیں، وقت اور کام کی ڈویژن کریں اور روز کی بنیاد پر مقررہ کام کرتے رہیں۔آپ نے کہیں جانا ہے تو وقت کا مارجن رکھ کر سفر کریں، وغیرہ وغیرہ۔آپ اپنی مصروفیات ومشاغل پر غور کر سکتے ہیں۔

تیسری قسم کا دباؤ ان ذمہ داریوں کا بوجھ ہے جو آپ خود لے لیتے ہیں۔آپ وہ کام اپنے سر

لے لیتے ہیں جو آپ کی ڈومین میں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے دوستوں کے احوال جان کر پریشان تو ہوتے ہیں مگر ہر دوست کی مدد نہیں کر سکتے۔ ہر قسم کی متعلقہ اور غیر متعلق خبریں، سوشل میڈیا کی غیر متعلق پوسٹیں دیکھنا، دوسروں کے معاملات میں مداخلت وغیرہ ایسے اقدام ہیں جن سے انسان پر دباؤ بڑھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان حسد، غیبت، کینہ، نفاق جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جادو، جاسوسی اور سازش جیسے اخلاقی رذائل انسان اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ علاوہ ازیں اپنی طاقت سے بڑھ کر مالی، جسمانی اور سماجی ذمہ داریاں بھی خودساختہ دباؤ کی وجہ بنتی ہیں۔

چوتھی قسم کا دباؤ انسان کے غیر موزوں طرزِ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ناقص اور غیر موزوں خوراک کا استعمال، نیند کی کمی، غفلت اور لاپرواہی برتنا یہ سب ذہن پر دباؤ بناتے ہیں جس کا عام طور پر ادراک نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ نے سوتے وقت معمول کے مطابق لباس نہیں بدلا، آپ کی چارپائی متوازن نہیں پڑی اور آپ جب بھی پہلو بدلتے ہیں چارپائی آواز کے ساتھ ہل جاتی ہے۔ آپ کے بستر میں بل ہیں مگر آپ نے اٹھ کر بستر درست نہیں کیا۔ آپ کو پیشاب کی حاجت ہے مگر آپ کا اٹھنے کو جی نہیں کر رہا۔ ان صورتوں میں یا تو آپ درست قدم لے کر اچھی نیند سو لیں گے یا پھر ساری رات سکون سے سو نہیں سکیں گے جس کا دباؤ اگلے دن کے اختتام تک آپ پر رہے گا۔ یہاں تک کہ اگر آپ کے بیٹھنے کے لیے جگہ موزوں نہیں یا آپ کے جوتے آرام دہ نہیں تب بھی آپ دباؤ میں ہوں گے۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (52)

مخطوطات پر تحقیق

یہاں ایک اور اسکالر تشریف فرما تھے۔ ان سے تعارف پر معلوم ہوا کہ ان کا نام ڈاکٹر حسین عطائی تھا۔ یہ ''عطائی'' اس معنی میں نہیں ہے جس میں ہمارے ہاں عطائی ڈاکٹر اور حکیم ہوتے ہیں۔ یہ ان کا نام تھا یا کسی صوفی سلسلے کی نسبت ہو گی۔ انہیں انگریزی سے واقفیت نہیں تھی۔ اس وجہ سے ان سے گفتگو عربی میں ہوئی۔ ڈاکٹر حسین بغداد اور دمام کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہے تھے۔ ان کا خاص میدان ''اصول الفقہ'' تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر شعبان کے ساتھ مل کر امام نسفی کی اصول الفقہ پر ایک کتاب کو ایڈٹ کر کے شائع کروایا تھا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض کروں کہ قدیم کتب کو ایڈٹ کرنا ایک بہت بڑا فن ہے۔ قرون وسطیٰ میں جب پرنٹنگ پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، تمام کی تمام کتب ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ ایک مصنف ہاتھ سے کتاب لکھتے۔ اس کے بعد ان کے شاگرد یا قریبی لوگ، ان کی لکھی ہوئی کتاب سے اپنے لئے نسخے تیار کر لیتے۔ اگر کتاب کی اشاعت بڑے پیمانے پر کرنا مقصود ہوتی تو اسے پروفیشنل کاتبوں کے حوالے کر دیا جاتا جو کتاب کا ایک ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ جو لوگ اس کتاب سے دلچسپی رکھتے، وہ ان نسخوں کو خرید لیا کرتے تھے۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے ان نسخوں کو مخطوطات (Manuscripts) کہا جاتا ہے۔

جدید دور میں جب پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قدیم اہل علم کی کتابوں کو جدید دور کے معیار پر شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں قدیم مخطوطات پر تحقیق کرنے کا آغاز ہوا۔ یہ مخطوطات یا تو مختلف لائبریریوں میں محفوظ تھے

یا پھر اہل ذوق نے انھیں اپنے ذاتی کتب خانوں میں شامل کر رکھا تھا۔ بہت سے مخطوطات عجائب گھروں میں موجود تھے۔لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ دنیا بھر میں موجود مخطوطات کی ایک فہرست تیار کی جائے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں مسلمان اسکالرز مستشرقین سے پیچھے رہ گئے۔ان مستشرقین میں کارل بروکلمان کا نام سرفہرست ہے۔انہوں نے ''تاریخ الادب العربی'' کے نام سے پوری دنیا کی لائبریریوں میں موجود مخطوطات کی فہرستیں تیار کیں۔ ان کی تیار کردہ فہرستوں سے آج بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔اس کے بعد بعض اہل علم نے ان فہرستوں میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ان میں ایک جرمن ترک اسکالر فواد سزکین کی ''تاریخ التراث العربی'' مشہور ہے۔

مستشرقین (Orientalists) مغربی دنیا کے ان اسکالرز کو کہا جاتا ہے جو مشرقی علوم میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ان میں سے مختلف اہل علم اپنے اپنے ذوق کے مطابق بدھ مت، ہندومت، اسلام اور دیگر مشرقی مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں مستشرقین کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ یہ لوگ صرف اور صرف اسلام دشمن ہوتے ہیں۔ان کی تصانیف کا مقصد ہی اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ استعمار کی سازش ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ یہ خیال جزوی طور پر درست ہے مگر اس تصویر کا ایک رخ اور بھی ہے۔

یہ بات تو درست ہے کہ مستشرقین کے ایک طبقے نے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے اور دین اسلام کی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن پانچوں کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے خالصتاً علمی انداز میں اسلام پر تحقیق کی ہے اور دیانتداری سے اسلام کی صحیح تصویر

پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان میں سے بہت سوں کو اللہ تعالی نے اسلام قبول کرنے کی توفیق بھی عطا کی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اور علوم کے بعض ایسے پہلوؤں پر مستشرقین کی تحقیقات موجود ہیں جن پر مسلمانوں میں سے کسی صاحب علم نے قلم بھی اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ رہے متعصب مستشرقین تو ان کی کتب کو ان کے تعصب کے باعث اب خود اہل مغرب مسترد کر چکے ہیں۔

ہمیں بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ نظریہ سازش کی دہائی دینے کی بجائے متعصب اور مخلص مستشرقین میں فرق کرتے ہوئے ان کے کام کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھائیں۔ موجودہ دور میں ایک زبردست امکان اس بات کا بھی موجود ہے کہ مخلص مستشرقین کے ذریعے ہم اسلام کی دعوت ان کی اقوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ ہر قوم کے لوگ باہر کے لوگوں کی نسبت اپنے اہل علم کی کتابیں پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اگر مستشرقین تک صحیح دینی علم پہنچا دیا جائے تو ان کے ذریعے اسلام کی دعوت ان کی اقوام میں پھیل سکتی ہے۔اس طرف کم ہی لوگوں نے توجہ دی ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب کے پرنس ولید بن طلال نے واشنگٹن میں ''مسلم کرسچن انڈر اسٹینڈنگ سنٹر'' قائم کیا ہوا ہے جس کے سربراہ جان ایل ایسپوزیٹو ہیں۔ اس طرز کے مزید ادارے قائم ہونے چاہییں تا کہ اسلام کی دعوت کو غیر مسلموں کے سامنے انہی کے علماء کے ذریعے پہنچایا جا سکے۔

خیر بات مخطوطات کی ہو رہی تھی۔ جب کوئی اسکالر کسی قدیم کتاب پر تحقیق کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ بروکلمان کی تیار کردہ فہرستوں کی مدد سے اس کتاب کے مختلف مخطوطات کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے کہ وہ کہاں کہاں موجود ہیں۔ اصل مخطوطے کا حصول تو ناممکن ہوتا ہے کیونکہ کثرت استعمال سے وہ ضائع ہو سکتا ہے۔اس مسئلے کے حل کے لئے لائبریریوں

اور میوزیمز کی انتظامیہ ان مخطوطات کی کاپی مائیکروفلم یا سی ڈی کی شکل میں فراہم کر دیتی ہے۔ محققین اس کتاب کے ایک نسخے پر انحصار کرنے کی بجائے عموماً زیادہ سے زیادہ نسخے اکٹھے کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ غلطی سے محفوظ رہا جاسکے۔

مخطوطوں کے حصول کے بعد یہ حضرات مختلف نسخوں کا جائزہ لے کر کتاب کو دوبارہ لکھتے ہیں۔ اگر ایک نسخے میں کتاب کا کوئی حصہ موجود نہیں ہے یا اس میں کاتب نے لکھنے میں کچھ غلطی کر دی ہے تو مختلف نسخوں کا جائزہ لے کر درست عبارت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے نہ صرف عربی زبان (یا جس زبان میں بھی مخطوطہ موجود ہو) میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس متعلقہ علم میں بھی مہارت حاصل کی جائے جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہو تاکہ مصنف کی بات کو درست طور پر سمجھا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کام بالعموم اعلی درجے کے ماہرین سرانجام دیتے ہیں۔ حال ہی میں ان ایڈٹ شدہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ انٹرنیٹ پر بلا معاوضہ مہیا کر دیا گیا ہے۔

دیانت کے پراجیکٹس

ڈاکٹر حسین عطائی سے فارغ ہو کر میں واپس ڈاکٹر شعبان کے پاس آیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ آگے نجانے کوئی انگریزی بولنے والا ملے یا نہ ملے، اس لئے بہتر ہے کہ اگلی معلومات ان سے ہی حاصل کر لی جائیں۔ میرا ارادہ تھا کہ دیانت کے دفتر کا بھی دورہ کر لیا جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دیانت کے پراجیکٹس کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے علاوہ میری خواہش تھی کہ اگر وہاں حدیث پراجیکٹ پر کام کرنے والے کوئی اسکالر مل جائیں تو ان سے بھی گفتگو کی جاسکے۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

ان اللہ مع الصّابرین

یہ زندگی اِک سفر ہی ہے نا
یہاں مسافت تو کاٹنی ہے
ہے عمر جتنی گزارنی ہے
سو اس کی راہوں پہ چلتے چلتے
جہاں جہاں تم قدم اٹھاؤ
تمہارے رستے میں پھول برسیں
جہاں جہاں تم نظر اٹھاؤ
تمام منظر سرور بخشیں
مگر یہ دنیا عجب جگہ ہے!
یہاں کے منظر جدا جدا ہیں
یہاں پہ پھولوں کے ساتھ ہوتے ہیں خار کتنے
یہاں پہ ملتے ہیں لوگ ایسے
جو چھین لیتے ہیں ہم سے صبر و قرار کتنے
بس اِک نظر!
اِن پہ ڈال کر ہم کو آگے بڑھنا ہے
جان لینا ہے زندگی......
ایک رہگذر ہے
ہماری منزل، ہمارے خوابوں کا گھر نہیں ہے
یہاں مسافت کے راستے میں
جو غم ملا بے ثمر نہیں ہے

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

پورا سیٹ منگوانے پر خصوصی رعایت

گھر بیٹھے کتب حاصل کرنے کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

0332-3051201 , 0345-8206011

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔
اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو
بھی پڑھوایئے۔اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلیے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجیے...... یا
ایک پے آرڈر/بینک ڈرافٹ بنام "ماہنامہ انذار" بینک الفلاح المحدود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوایئے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جا سکتا ہے

Monthly
INZAAR

APR 2018
Vol. 06, No. 04
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi